اجتہاد اور اُس کی عصری تطبیقات

جناب محمد امین صاحب ۔ ریاض ۔ سعودی عرب

حال ہی میں راقم کو اس علماء کنونشن کی مطبوعہ رو داد کا تفصیلی مطالعہ کرنے کا موقع ملا، جو ۳ اور ۵ جنوری ۱۹۸۴ء کو صدر پاکستان کی زیر صدارت اسلام آباد میں ہوا۔

اجتہاد کمیٹی اس کنونشن میں جو مختلف کمیٹیاں بنائی گئی تھیں ان میں ایک اجتہاد کمیٹی بھی تھی، اِس کمیٹی نے جو سفارشات پیش کیں اُن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ:

> "پاکستان کے اندر ایسے جید علماء و فضلاء کا بورڈ تشکیل دیا جائے جن کی دیانت، تبحر علمی، تقوٰی، عربی زبان پر عبور اور علومِ قرآنی اور حدیثِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) میں اُن کا مطالعہ ہی نہ ہو بلکہ پاکستانی عوام بھی اُن پر پورا اعتماد رکھتے ہوں۔ نیز بورڈ کے علماء کی معاونت کے لیے اس بورڈ کو ملک کے اندر پیدا ہونے والے قانونی مسائل کے حل کے لیے استخراج و استنباط کی ذمہ داری سپرد کی جائے"[1]

اس تجویز پر بحث کرتے ہوئے جناب مولانا محمد تقی عثمانی صاحب، جج شرعی بنچ عدالتِ عظمٰی پاکستان نے فرمایا کہ اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ اسلام نے اجتہاد کے لیے عیسائیت کی طرح تو ریشی اقتدارِ اعلیٰ کی تنظیم قائم نہیں کی اور یہ کہ اُن کے خیال میں کسی ایسے ادارے کا قیام مناسب

---

[1] تقاریر و تجاویز علماء کنونشن مطبوعہ وزارت مذہبی امور۔ صفحہ ۲۱۱۔

نہیں ہے جو اجتہاد کے معاملے میں حرفِ آخر کا درجہ رکھے اور پھر اس کے خلاف اجتہاد کرنے کا کوئی راستہ نہ رہے۔[1]

اس بات سے قطع نظر کہ جس کمیٹی نے یہ تجویز پیش کی تھی وہ ۲۷ علماء اور سکالرز پر مشتمل تھی، اور اس میں ملک بھر کے جید علماء شامل تھے، ہم یہ سمجھتے ہیں کہ مولانا عثمانی صاحب کے نقطۂ نظر سے اتفاق کرنا مشکل ہے اور معاملے کی علمی اور عملی اہمیت کے پیشِ نظر یہ غیر مناسب نہ ہوگا، اگر اس پر ذرا تفصیلی غور کر لیا جائے۔

فقہ اسلامی کی تاریخی نمو

سوال یہ ہے کہ فقہ اسلامی کی تاریخی نمو جس طرح ہوئی کیا وہ ایک طے شدہ اور مثالی طریقِ کار تھا یا وہ حوادثِ زمانہ کے پیشِ نظر ان مخصوص حالات کے اندر ایک بہتر طریقِ کار تھا؟ (BEST IN THE SITUATION) اور کیا ان سیاسی اور اجتماعی حالات کے بدل جانے کے بعد معاملے پر از سرِ نو غور کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ ہمارے نزدیک دوسرا نقطۂ نظر صحیح ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ خلافتِ راشدہ میں اور خصوصاً حضرت ابوبکرؓ صدیق و عمر فاروقؓ کے زمانے میں جتنے بھی اجتہادی فیصلے ہوئے وہ "سرکاری" سطح پر ہوئے اور ان کی حیثیت "شورائی اجتہاد" کی تھی۔ اگرچہ ان میں آزادانہ بحث و مناظرہ ہوا، بعض حضرات نے کھلم کھلا خلیفۂ وقت (جو خود بھی مجتہد ہوتا تھا) کی رائے سے باصرار اختلاف کیا، لیکن فیصلہ بہرحال خلیفہ کی صدارت میں اور شوریٰ کی رائے سے ہوا۔

اب یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ خلافتِ راشدہ کا نظام جاری نہ رہ سکا اور اس نظام کو جاری رکھنے کی جدوجہد میں مصلحینِ امت اور سیاسی حکمرانوں کے درمیان جو تصادم ہوا وہ بظاہر اس دوسرے فریق کی شکست پر منتج ہوا۔ اس کے ساتھ ہی حضرت امام حسینؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی شہادت پر جو صدمہ امت اور علماء و صلحاءِ امت کو پہنچا اور اس سے جو رویے مستحکم ہوئے انہوں نے اقتدار اور اہلِ علم میں ایک مستقل تفریق سی پیدا کر دی۔ علماء نے اقتدار سے قطعِ تعلق کر لیا اور مسجد و مدرسہ پر اپنی توجہ مرکوز کر دی اور سیاسی حکمران آہستہ آہستہ دنیادار ہوتے گئے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بنو امیہ کے ابتدائی حکمرانوں میں جو علم اور دینی رسوخ موجود تھا وہ بعد میں معدوم ہوتا چلا گیا اور خلافت بھی

---

[1] تقاریر و تجاویز علماء کنونشن، مطبوعہ وزارت مذہبی امور، صفحہ ۲۱۱

وراثت میں بدل گئی۔

ادارۂ شوریٰ کا خاتمہ | اس تفریق کا ایک بڑا نقصان یہ ہوا کہ شوریٰ کا ادارہ ختم ہوگیا، حکمرانوں نے اپنی من مانی شروع کردی اور امورِ مملکت میں مشورے کے لیے وہ اپنے وزراء اور حکام پر تکیہ کرنے لگے، لیکن جہاں تک دینی امور کا تعلق تھا چونکہ ایسے حکمران اور ایسی شوریٰ باقی نہ رہی جس پر عوام کو اعتماد ہوتا۔ کیونکہ حکمران اپنی سیاسی اغراض کی خاطر اب ایک ایسی شوریٰ بنانے پر تیار نہ تھے جس کو کوئی قوت اور رسوخ حاصل ہوتا اور ان کی اپنی مرضی نہ چل سکتی، لہٰذا عوام نے دینی مسائل میں علماء و صلحاءِ اُمت سے رجوع کرنا شروع کردیا اور اجتماعی شورائی پلیٹ فارم کی غیر موجودگی میں معاملات انفرادی فتاویٰ پر چلنے لگے اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے، کیونکہ وہ نظام صدیوں تک جاری رہا تا آنکہ پچھلی صدی ہجری میں اتاترک نے قبائے خلافت چاک کردی۔ اس کے بعد مسلمان ممالک آہستہ آہستہ مغربی قوموں کی سیاسی غلامی سے آزاد ہونا شروع ہوئے اور اب ان کی کثیر تعداد آزاد ہو چکی ہے۔ کمزوری اور زیردستی کے بعد اب جو نہوض (اُٹھان) کا دور شروع ہوا ہے اور اس میں جو سیاسی ادارے وجود میں آئے اور آرہے ہیں اُن کی اپنی خوبیاں اور کمزوریاں ہیں (جس طرح کہ پُرانے وراثتی خلافتی نظام کی بعض خوبیاں اور کمزوریاں تھیں)۔

موجودہ دَور کے مسلمان معاشروں کا المیہ یہ ہے کہ یہاں مغربی فکر اور مغربی تہذیب و تمدن کا غلبہ ہے۔ ہمارے پڑھے لکھے لوگوں کی ایک بڑی تعداد (خصوصاً وہ لوگ جو قانون و سیاست اور انتظامِ مُلکی سے متعلق ہیں) مغرب کے اس تعلیمی اور تہذیبی اثرات کے حصار سے نکلنے پر قادر نہیں ہیں، بلکہ اس کا ارادہ بھی نہیں رکھتے۔ وجہ یہ ہے کہ اس میں انہیں نفسیاتی، معاشی، معاشرتی اور پیشہ وارانہ اُلجھنوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور قربانی دینا پڑتی ہے۔

اس ضمن میں ایک تازہ مثال بے مصرف ثابت نہ ہوگی۔ فقہ اسلامی کے ایک بڑے مؤید اور مفکر علامہ اقبالؒ کے فرزند ارجمند جناب ڈاکٹر جاوید اقبال نے جو اتفاق سے پنجاب کی عدالتِ عالیہ کے چیف جسٹس بھی ہیں؛ فرمایا ہے کہ اجتہاد کے لیے عربی دانی کی شرط ختم کردی جائے[۱]۔ (ادّعا یہ کہ

[۱] جسارت کراچی۔ ۲۸ اکتوبر ۱۹۸۴ء۔ سرگودھا بار سے خطاب۔

وکلام اجتہاد کر سکیں ۔ کیونکہ قرآن وسنت کو سمجھنے کا دعویٰ تو ترجموں کی مدد سے بھی کیا جا سکتا ہے۔)

اس موقع پر اقبالؒ کا یہ شعر بہ تصرفِ ادنیٰ ؎ ضرور یاد آتا ہے کہ ؎

خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں

ہوئے کس درجہ فقیہانِ "جدد" بے توفیق[1]

ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب سے بصد ادب یہ پوچھنے کو جی چاہتا ہے کہ کیا وہ تصور کر سکتے ہیں کہ کوئی صاحب انگریزی قانون میں پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ لکھیں اور انہیں انگریزی زبان نہ آتی ہو یا یہ مطالبہ کیا جائے کہ ڈاکٹروں پر سے ایم بی بی ایس کی ڈگری حاصل کرنے کی شرط ختم کر دی جائے۔

—بہر حال ذکر یہ ہو رہا تھا کہ ہمارے اکثر برسر اقتدار لوگوں پر مغربی تہذیب نے یہ جادو کر رکھا ہے کہ وہ اسے معیار سمجھتے ہیں اور اسلام نے جو معیار ہمیں دیئے ہیں ان پر غور کرنے کے لیے وہ تیار ہی نہیں ہیں۔

اجتہاد کے لیے عربی زبان دانی کی اہمیت اب اسی اجتہاد، شوریٰ اور پارلیمنٹ کے مسئلے کو لیجیے مغربی جمہوری نظام میں چونکہ حاکمیت عوام کے لیے ہے، اس لیے جو لوگ ان کے نمائندے منتخب ہوتے ہیں انہیں قانون سازی کا مطلق حق حاصل ہوتا ہے، اب یہ بات اسلامی معاشرے میں سرے سے موجود ہی نہیں ہے کیونکہ اسلام میں مسلمانوں کے لیے مطلق قانون سازی کا کوئی تصور ہے ہی نہیں۔ یہاں قانون دینے والے خود سبحانہٗ تعالیٰ ہیں، ہاں ہمارے لیے اجتہاد کے دروازے کھلے ہیں۔ اب پچھلی صدیوں کے عظیم فقہی سرمایے پر ذرا ایک نظر ڈال لیے اور بتایئے کہ کیا اس عرصے میں کوئی ایک بھی ایسا عالم، فقیہ یا اصولی گزرا ہے جس نے یہ کہا ہو کہ اجتہاد کے لیے قرآن وسنت اور عربی زبان میں رسوخ شرط نہیں ہے؟ اس کے برعکس ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ امام غزالیؒ نے فرمایا: "ایک عام آدمی اجتہاد نہیں کر سکتا کیونکہ اہلیت نہ رکھنے کی وجہ سے وہ اس کام کے لیے اسی طرح نااہل ہے جس طرح نابالغ بچہ اور فاتر العقل آدمی"[2] اور امام شافعیؒ نے فرمایا: "اجتہاد

---

[1] اس غیر شاعرانہ تصرف کے لیے روحِ اقبالؒ سے معذرت کے ساتھ۔

[2] المستصفیٰ للغزالی جلد ۱ ص ۱۸۲ طبع دار الصادر۔

کی اہلیت نہ رکھنے والا اگر اجتہاد کرے تو اس کی حیثیت اس اندھے کی سی ہے جو خود بھی رستہ نہیں دیکھ سکتا (دوسرے کو کیا دکھائے گا؟) اس کے باوجود اگر وہ اجتہاد کرے تو گناہ گار ہوگا، حکومت کو چاہیے کہ زبردستی اسے اس کام سے روک دے[۱] اور عربی زبان کے متعلق تو امام شاطبیؒ نے یہاں تک کہا ہے کہ ''اجتہاد کرنے والے کو ''مجتہد فی اللغۃ'' ہونا چاہیے۔ اگرچہ یہ اجتہاد کے وسائل میں سے ہے''[۲]

اسمبلی اور بورڈ تو کیا اس قسم کی صفات ہماری قومی اسمبلی یا مجلسِ شوریٰ کے ممبران میں ہوتی ہیں؟ (جن کا ذکر فقہاء اور اصولیوں نے متفقہ طور پر کیا ہے) یا کیا یہ شرط ان کے لیے رکھ کر قومی اسمبلی کے لیے الیکشن کروائے جا سکتے ہیں؟ ظاہر ہے یہ ناممکن ہے اور نہ اس پر کوئی تیار ہوگا۔ اب دوسری طرف دیکھیے کہ اگر علماء کی کوئی کونسل یا بورڈ بنایا جائے (کیوں کہ علماء ہی میں یہ شروط ممکنہ حد تک موجود ہو سکتی ہیں) تو اسے ''مشاورتی'' کا درجہ دیا جائے گا اور بات پھر انہی حکمرانوں اور سول سروس کے بزرجمہروں پر پہنچ کر رُک جائے گی کہ وہ مناسب سمجھیں تو اس کونسل یا بورڈ کی سفارشات کو مانیں اور چاہیں تو نہ مانیں۔ (جیسا کہ نظریاتی کونسل کی سفارشات کا حشر ہمارے سامنے ہے)۔

موجودہ زمانے میں اس اعتماد اور پہچان کی ایک ہی صورت قابلِ اعتماد رہ گئی ہے اور وہ انتخاب کی ہے، لہٰذا ہمیں کوئی ایسا راستہ سوچنا ہوگا کہ الیکشن کی قباحتوں سے بچ کر اس طرح کے لوگ مجلسِ شوریٰ یا اسمبلیوں میں پہنچ سکیں تاکہ وہ اجتہاد کر سکیں اور یہ اجتہاد اُمت کے لیے قابلِ قبول بھی ہو۔ ورنہ اگر دین سے ناواقف لوگ اجتہاد کرتے بھی رہیں اور قانون بناتے بھی رہیں تو ان کی یقیناً کوئی پذیرائی نہ ہوگی۔ وہ غیر اسلامی قانون بناتے رہیں گے اور لوگ اُن کی مخالفت کرتے رہیں گے اور اس طرح ہماری صلاحیتیں باہمی انتشار کا شکار ہوتی رہیں گی اور ہم عنداللہ ماخوذ بھی ہوں گے۔

مسئلے کا حل یہاں اس نکتے کی وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ

---

[۱] الرسالۃ للشافعی صفحہ ۵۰۹ طبع دار التراث بالقاہرہ۔

[۲] الموافقات للشاطبی جلد ۴ ص ۱۰۸ طبع المکتبۃ التجاریہ۔

شوریٰ یا کمیٹی کے سارے ممبران ہی یہ "متخصص فقہا" ہونے والی سنت موجود ہو بلکہ خلفائے راشدین کے تعامل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی شوریٰ میں دو طرح کے لوگ تھے۔ ایک بڑی تعداد ان لوگوں کی تھی جو قبیلوں کے سربراہ اور علاقوں کے معزز ترین تھے اور اس کے ساتھ ہی کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو قرآن و سنت اور فقہ کا گہرا اور خصوصی علم رکھتے تھے۔ عمومی مسائل میں ساری شوریٰ سے رائے لی جاتی تھی لیکن پیچیدہ دینی اور فقہی مسائل میں صرف ان متخصص حضرات کو رائے اور بحث کے لیے بلایا جاتا تھا۔[۱] اسی پر قیاس کرتے ہوئے آج یہ کہا جا سکتا ہے کہ شوریٰ میں اکثریت ان لوگوں کی ہو سکتی ہے جو عوام کے معتمد ہوں، ان میں بارسوخ ہوں، اسلامی احکام کو جاننے والے اور اُن پر عمل کرنے والے ہوں اور زندگی کے مختلف شعبوں کے مسائل سے ماہرانہ واقفیت رکھتے ہوں، لیکن ان ممبران میں بہرحال کچھ تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہونی چاہیے جو قرآن و سنت نیز فقہ اور عربی زبان میں خصوصی مہارت رکھتے ہوں، فقہی اور قانونی معاملات میں ان کی رائے کو باقی لوگوں کی آرا کے مقابلے میں خاص وزن حاصل ہونا چاہیے۔

ایک آئینی و دستوری نظام رہا یہ سوال کہ اس سیدھی سادھی بات کو قانونی اور دستوری شکل کیا دی جائے؟ تو اس کی کئی صورتیں ممکن ہیں۔ سب سے بہتر صورت یہ ہے کہ الیکشن میں سیاسی جماعتیں حصہ

---

[۱] معاصرین میں سے جنہوں نے اس رائے کو اختیار کیا ہے ان میں شیخ ذکریا البری (مجلہ، عالم الفکر، الکویت، شمارہ جنوری۔ مارچ ۱۹۷۱ء صفحہ ۱۳۱) اور ڈاکٹر محمد یعقوب الملیجی (کتاب مبدأ الشوریٰ فی الاسلام، صفحہ ۲۳۴ طبع اسکندریہ) قابلِ ذکر ہیں۔

یہاں یہ بھی ملحوظ رہے کہ اگرچہ سیاسہ شرعیہ پر لکھنے والے فقہاء نے اہل الشوریٰ، اہل الحل والعقد اور اہل الاختیار کی اصطلاحیں بطور مترادف کے استعمال کی ہیں لیکن بعض فقہاء نے ان میں "علما" اور "اہل الاجتہاد" کو شامل کیا ہے مثال کے طور پر ملاحظہ ہو:

— عبدالقاہر بغدادی: اصول الدین، صفحہ ۲۷۹ طبع بیروت ۱۴۰۰ھ

— قاضی ابویعلی: الاحکام السلطانیہ، صفحہ ۱۹ طبع مصر ۱۳۰۶ھ

— امام نووی: منہاج الطالبین وعمدۃ المفتیین، صفحہ ۱۲۰ طبع مصر ۱۳۱۰ھ

لے رہی ہوں اور انتخابات متناسب نمائندگی کی بنیاد پر ہوں۔ سیاسی جماعتوں کو پہلے سے باخبر کر دیا جائے کہ انہیں اپنی فہرست میں علماء اور سکالرز کو رکھنا چاہیے۞ جو کامیابی کی صورت میں شوریٰ یا اسمبلی کے اندر ان کی نمائندگی کر سکیں۔ مجلس شوریٰ میں سیاسی جماعتوں کی حاصل کردہ نشستوں کے تناسب سے ہر جماعت کو ایک ایسی کمیٹی میں نمائندگی دی جائے جسے "اجتہاد کمیٹی" کہا جائے۔ یہ ایک خود مختار کمیٹی ہو جو اپنا چیئرمین خود چنے اور اپنا طریق کار خود وضع کرے۔ انتخابی قواعد میں ایک قانون کا اضافہ کیا جائے جس میں اس کمیٹی کے ممبران کی صفات و شروط بیان کر دی جائیں۔ (اور یہ شروط وہی ہوں جو سارے علماء و فقہاء اور اصولیوں کے نزدیک متفق ہیں اور جو مجتہدین کی صفات کے طور پر فقہ اور اصولِ فقہ کی ساری کتابوں میں ملتے ہیں) اور کمیٹی کو یہ حق ہو کہ اگر وہ دو تہائی اکثریت سے یہ سمجھے کہ اس کے کسی ممبر میں اس طرح کی مطلوبہ صفات نہیں پائی جاتیں، تو وہ اس کی ممبرشپ ختم کر دیں اور متعلقہ سیاسی جماعت اس کی جگہ اسمبلی میں منتخب شدہ کسی دوسرے آدمی کا نام دے۔ سارے مسودہ ہائے قانون، مجلس شوریٰ میں ابتدائی اور عمومی بحث کے بعد اس کمیٹی کو بھجوا دیے جائیں، اس کمیٹی کو یہ اختیار ہو کہ وہ ہر قسم کے ماہرین کی خدمات سے استفادہ کر سکے۔ اس کمیٹی کا فیصلہ حتمی ہوگا۔ یہ گنجائش بھی رکھی جا سکتی ہے کہ مجلس شوریٰ کے باقی ممبران اور صدرِ مملکت اس کمیٹی کے پاس کردہ بل کو غور کے لیے مع مطلوبہ ترمیمات کے کمیٹی کے پاس واپس بھجوا سکیں، لیکن انہیں یہ اختیار نہیں ہونا چاہیے کہ وہ اس فیصلے کو رد کر سکیں۔ پرانے غیر اسلامی قوانین پر نظرِ ثانی کا کام بھی یہی کمیٹی کر سکتی ہے۔ اس کمیٹی کے پاس کردہ کسی بھی قانون کو عدالتِ عظمیٰ میں اس بنیاد پر چیلنج کرنے کی راہ بھی رکھی جا سکتی ہے کہ وہ قرآن و سنت کے خلاف ہے لیکن اس کے ساتھ پھر یہ بھی ضروری ہے کہ عدالت کے جج صاحبان بھی قانونِ شریعت کے ماہرین پر مشتمل ہوں اور ان صفات کے حامل ہوں جو اس اجتہاد کمیٹی کے ممبران کے لیے قانون نے مقرر کی ہوں۔ اس تعریف کے مطابق چند ججوں پر مشتمل ایک جداگانہ بنچ بھی اس خاص ذمہ داری کو ادا کر سکتا ہے۞

۞ کوئی خاص تناسب بھی مقرر کیا جا سکتا ہے۔ (ن۔ص)

۞ شریعت کورٹس (اور قاضی عدالتوں) کا جو تصور پیدا ہوا ہے اور جس کے تحت (باقی صفحہ آئندہ)

ہماری رائے میں صرف اس طرح کا ایک ادارہ ہی ہماری موجودہ قانونی مشکلات کا حل ثابت ہو سکتا ہے جو منتخب اور با اختیار بھی ہو اور اہل لوگوں پر مشتمل بھی ہو۔ غیر جماعتی الیکشن کی صورت میں یہ طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے کہ جو علماء اور سکالرز بھی منتخب ہو کر اسمبلی میں پہنچیں، ان پر مشتمل یہ کمیٹی بنا دی جائے۔⑤ باقی تفصیلات ممکنہ حد تک وہی ہوں جن کا ہم نے ابھی ذکر کیا ہے۔

تلخیصاً عرض ہے کہ ماضی کی فقہی صورتِ حال کو نظیر کے طور پر پیش نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ وہ ایک مخصوص حالات کی پیداوار تھی۔ اگر عوام کے معتمد علیہ علماء و فقہاء پر مشتمل کوئی مجلسِ شوریٰ خلافتی نظام میں موجود ہوتی تو یقیناً علماء کو انفرادی یا اجتماعی (لیکن غیر سرکاری)[1] کوششیں تدوینِ فقہ کے لیے نہ کرنی پڑتیں۔ اب اگر ماضی کا سیاسی ڈھانچہ ٹوٹ گیا ہے تو آخر کیوں نہ سوچا جائے کہ اُمت کے معتمد علیہ علماء پر مشتمل ایک ایسا ادارہ قائم کیا جائے۔ جو اُمت کے لیے شورائی اجتہاد کا پلیٹ فارم ثابت ہو (جو شوریٰ ہو یا شوریٰ کا ایک جزو ہو) اور یہ بات صرف علمی اہمیت ہی کی حامل نہیں بلکہ اگر اربابِ حل و عقد چاہیں تو اس طرح کی کسی سکیم پر وہ غور کر سکتے ہیں تاکہ ایک ایسا اجتہادی ادارہ وجود میں آسکے جو شرعی تقاضوں کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ عصری تقاضوں کو بھی پورا کر سکے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) عدلیہ میں جزوی طور پر یہ تجربہ بھی ہو رہا ہے (خواہ وہ معیار سے کتنا کم ہو) اس کی روشنی میں بآسانی اجتہاد کمیٹی کے فیصلوں کی عدالتی جانچ کی جا سکتی ہے اور اس کے لیے راہیں نکالی جا سکتی ہیں۔ (ن - ص)

(حاشیہ صفحہ ہذا)

⑤ اس کے لیے کوئی میکنزم - اور معیار تجویز کرنے کی ضرورت ہے کہ کسی کے صلاحیتِ اجتہاد کا معیار کیا ہو اور کون اس بارے میں فیصلہ کرے۔ (ن - ص)

[1] اس کی بہترین مثال وہ پرائیویٹ مجلسِ اجتہاد ہے جس میں چند علماء نے امام ابوحنیفہؒ کی سربراہی میں سالہا سال کام کیا۔